اشاعت گھر
حیدرآباد دکن

پہلا ایڈیشن

جنوری ۱۹۴۴ء

مالکان

اشاعت گھر

غوث محی الدین (عثمانی)

چندر سین جایسوال

قیمت

عہ/ ۱۲/

شکریہ!

اظہار شکریہ کا فرض خود مخدوم محی الدین صاحب ادا کرنا چاہتے تھے لیکن ان کا ارادہ عملی شکل اختیار کرنے نہ پایا تھا کہ انہیں "قومی ہفتہ" کے سلسلہ میں ایک "مضرت رساں" تقریر کرنے کے جرم میں تین مہینوں کے لئے جیل بھیجدیا گیا۔ اس وجہ سے یہ خوشگوار فریضہ ہم ادا کر رہے ہیں۔

"سرخ سویرا" کا حسن کارانہ نقش ہندوستان کے بہت بڑے آرٹسٹ عبدالرحمن چغتائی کے موقلم کا رہین منت ہے۔ اس کی انقلابی معنویت کو مصور نے "مشین" "مزدور" اور "وقت" کے ذریعہ رنگ اور خطوط کی شکل دی ہے۔ شاعر کے کلام کی اس معنی خیز اور جاذب نظر تصویر کے لئے چغتائی کی خدمت میں ہم ہدیہ تشکر پیش کرتے ہیں۔

"سرخ سویرا" اپنی کتابت و طباعت کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا کہ شاعر کے نام سبط حسن صاحب رکن ادارت "قومی جنگ" کا مکتوب وصول ہوا جس میں صاحب موصوف نے جو خود "نیا ادب" کے بانیوں میں سے ہیں، مخدوم کی شاعری پر اپنے مخصوص دلکش انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ ہمارے اصرار پر شاعر نے اس خط کو کتاب کے "دیباچہ" کی حیثیت سے شایع کرنے کی اجازت دیدی تھی جس کے لئے ہم مخدوم اور سبط حسن دونوں کے ممنون ہیں۔

غوث محی الدین (عثمانیہ)
ناشر

فہرست

بمبئی
۲۵ر دسمبر ۱۹۴۳ء

مجی مخدوم

مجھے آج نہ جانے کیوں آٹھ سال پہلے کی برسات یاد آرہی ہے جولائی کی شام حیدرآباد کے ایک وسیع ہال میں بزم مشاعرہ، میں محفل کے لئے اجنبی، محفل میرے لئے اجنبی کہ اتنے میں تم نے اپنی ایک نظم سنائی "دھان کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی" —— یہ نظم "طور" کے عنوان سے ایوان مرحوم میں اس سے پہلے چھپ چکی تھی اور مجاز نے اور میں نے اسے یادش بخیر علی گڈھ میں کئی بار لذت لے لے کر پڑھا بھی تھا لیکن نظم لکھنے والے سے اب تک ملاقات کی نوبت نہ آئی تھی۔ بارے یہ خواہش بھی پوری ہوئی نظم پڑھتے پڑھتے جب تم اس مصرع پر پہونچے تھے کہ "خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے" تو میں نے قاضی صاحب[۱] سے کہا تھا دیکھئے ہمارے نوجوان شاعروں میں محبت کا کتنا پاکیزہ اور معصوم تصور پیدا ہو رہا ہے اور انھوں نے جواب دیا تھا کہ "خدا اس نئی پود کو پروان چڑھائے جو خدا کے سامنے پیار کرنے سے نہیں جھجکتی اور جن کا خدا بھی اتنا مشفق اور مہربان ہے کہ محبت کے اس معصوم مظاہرے پر خوش ہوتا ہے"۔ اسی رات میری اجنبیت دور ہو گئی ہم دونوں پہلی بار ملے اور دوست بن گئے۔

---

[۱] قاضی عبدالغفار صاحب مصنف "لیلیٰ کے خطوط"

سوچتا ہوں اس آٹھ سال میں تمھاری شاعری نے کتنی منزلیں طے کی ہیں کتنے دوراہوں سے گزری ہے! ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے کہ اس آٹھ سال میں ہماری سماج نے کتنی منزلیں طے کی ہیں، کتنے دوراہوں سے گزری ہے، کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں اور آج ذہنی پستی اور اخلاقی شکست کے کس گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ سوسائٹی کے اس کرب کو اس بے چینی اور جدوجہد کو بڑے سے بڑے شاعر کا قلم بھی پوری قوت سے بیان نہیں کرسکتا۔ لیکن مبارک ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھ زمانے کی نبض پر رہتے ہوں اور جو وقت کی رفتار تیز کرنے پر قادر نہ ہی لیکن اس سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتے ہوں اُس کے دل کی دھڑکن محسوس کرتے ہوں۔ اسی لئے تو مجھے تمھارے اشعار بہت پسند ہیں۔

مخدوم! بتاؤ زندگی سب سے بڑی حقیقت ہے یا زندگی کا ارتقا۔ تم کہو گے زندگی اور اس کا ارتقاء دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ میں جانتا ہوں لیکن تم اُن ادیبوں اور آرٹسٹوں کو کیا کہو گے جو زندہ ہیں لیکن زمان و مکان کی تمام ذمہ داریوں سے بے نیاز ہیں۔ زندگی کی رفتار کتنی بڑھ جائے، آلام حیات کتنی شدت اختیار کرلیں لیکن انھیں اپنی داستانِ غم کے اوراق کا آموختہ پڑھنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ کیا یہ لوگ اپنے آرٹ کے بارے میں مخلص نہیں۔ کیا یہ صرف اس وجہ سے شاعری کرتے ہیں کہ انھیں کچھ اور آتا ہی نہیں یا اشعار موزوں کرنا ان کی عادت ثانیہ بن گئی ہے۔

خیر چھوڑو اس قصے کو۔ یہاں تو ذکر تمھاری دس سالہ شاعرانہ زندگی کا تھا۔ اس کا فیصلہ تو مورخ ادبی کرے گا کہ تمھاری شاعری نے ہندستانی نوجوانوں —— بالخصوص دکن کے نوجوانوں —— کے فکر اور عمل پر کیا اثر ڈالا ہے لیکن ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمھاری شاعری عصرِ حاضر کے اضطراب اور احساس کی آئینہ دار ضرور ہے۔

ہمارے فنی شعور میں ہر جگہ سماجی شعور کی روح ضرور تڑپتی نظر آتی ہے۔

ہمارے اکثر ادیبوں میں بعض خیالات مشترک ہیں۔ غلامی کی لعنتوں سے بغاوت کا احساس، سماج کی روایتی فرسودہ اور مضرت رساں قدروں سے بغاوت کا احساس اور پھر آزاد اور روشن مستقبل کا دھندلا سا تصور۔ یہ ایک مثلث نما محور ہے جس پر پچھلے دس سال سے ہماری سماجی زندگی اور ہمارے فنون لطیفہ دونوں گھوم رہے ہیں۔ اس مثلث کا ایک زاویہ ہمارے اکثر نوجوان شاعروں کا منظور نظر ہے روایتی قدروں سے بغاوت کا زاویہ۔ ہر نوجوان جس نے عشق کیا ہے اور نامراد ہوا ہے، جانتا ہے کہ سماج کی روایتی قدروں نے اُس کی عشقیہ زندگی پر کیسی کیسی ضربیں لگائی ہیں۔ خاندان کی مخالفت، بدنامی کا ڈر، اخلاقی جرأت کی کمی، طبقاتی اونچ نیچ کا احساس غرض نجانے کتنے عناصر ہیں جن کی بدولت محبت کا دل خون ہوا ہے پچھلے دس بارہ سال کے ادبی رسالوں اور مجموعوں کو دیکھ جاؤ، تمھیں سینکڑوں ایسی نظمیں ملیں گی جن میں ان سماجی پابندیوں کے خلاف دل کا بخار نکالا گیا ہے اُن دنوں کی یاد تازہ کی گئی ہے جب زندگی سرشار اور شادکام تھی۔ ۳۵ء کے دور کی ہماری نظمیں محرومی کے احساس سے خالی نہیں ہیں اور خالی کیسے ہوتیں جوانی کا آغاز، عشق کی ابتدا، جذبات کی شدت اس پر واردات قلب کو موزوں کرنے کی صلاحیت پھر تیر کیوں کر خطا کرتا۔ "انتظار" کی گھڑیاں گزاری گئیں ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

اور حسن کی خلاقی تو دیکھیے کہ ع بج رہی تھی میرے غمخانے میں شہنائی سی۔ اور جب وہ مدت کے انتظار کے بعد آیا تو عاشق پیشہ شاعر نے "سجدہ" کیا اور جب وہ چلا گیا تو شاعر کو وہ گھڑیاں یاد آنے لگیں، ہم یہاں ملے تھے، یوں باتیں کی تھیں،

یوں پیار کیا تھا، یوں کھیتوں میں پانی کے کنارے بیٹھے تھے لیکن سے

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آبِ رواں باقی
مگر اس عیشِ رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

مگر تمھاری ان نظموں میں شک ہے کہ یادِ ماضی کی تلخی اور ذہنی علالت نہیں جھلکتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ان تجربوں سے خوش ہے زندگی کے ان واردات سے نہ نفرت کرتا اور نہ ان پر شرمندہ ہے بلکہ ان کو یاد کرتا ہے اور لذت لیتا ہے۔

مجھے اکثر نوجوان شاعروں سے یہ شکایت ہے کہ وہ محبت کا عجیب غریب معیار قائم کیے ہوئے ہیں ان کے خیال میں اس انقلابی دور میں "ہمارے لئے" یعنی مردوں کے لئے" یہ مناسب نہیں کہ عورتوں کی محبت کے "خیال" میں پھنسیں۔ یہ عمل کا وقت ہے ہاں انقلاب کرنے کے بعد جب فرصت ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ اسی لئے بعض شاعر اپنی محبوبۂ دلنواز کو بڑے پندار اور پدرانہ شفقت سے نصیحت کرتے ہیں کہ تم گھر لوٹ جاؤ کیونکہ تم میں مجھ جیسے انقلابی کے پہلو بہ پہلو چلنے کی طاقت نہیں ہے البتہ جب مجھے انقلاب سے فرصت ملے گی تو میں آجاؤں گا۔ بیچارے برخود غلط شاعر — اس کے برعکس تمھارا ایک شعر یاد آرہا ہے سے

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں، اُن کی جوانی ساتھ ہے

شائد تمھیں یرقان کبھی نہیں ہوا؟ گھبراؤ نہیں میں طبابت نہیں کرنا چاہتا میرا مقصد تو صرف یہ بتانا ہے کہ تمھارا مشاہدہ، تجربہ، اور زاویہ نظر کبھی کسی ایسی ذہنی بیماری کا شکار نہیں ہوا جس کا اثر تمھاری شاعری پہ پڑتا۔ تمھارا عشق اور زندگی کا تصور اور سماجی کشاکش کا شعور سبھی صحت بخش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فاشزم کی امن شکن اور تہذیب سوز آندھیاں چلنے لگیں تو تم نے بہتوں سے پہلے اس آنے

والے خطرہ کو محسوس کر لیا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب حبشہ پر مسولینی کے حملہ کے بعد تم بڑے جوش میں آئے تھے اور اپنی نظم "جنگ" مجھے سنائی تھی ؎

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

غالباً یہ تمھاری پہلی سیاسی نظم تھی اور فاشزم کے خلاف اردو شاعری کی پہلی صدائے احتجاج۔ لیکن اس نظم کے آخری اشعار سے وہی بے بسی اور بے چارگی ٹپکتی ہے جو اس وقت ہماری پوری قوم پر طاری تھی۔ فاشزم اپنی تباہ کاریوں سمیت بڑھ رہا تھا اور یورپ کی سامراجی طاقتیں —— برطانیہ اور فرانس —— فاشزم کی رضا جوئی میں لگی تھیں اس بھوکے دیو کو انسانیت کا خون پلا پلا کر مضبوط کر رہی تھیں۔ ہندستانی قوم حبشہ کی آزادی کی حامی تھی اس کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن برطانوی سامراج کی غلامی کے ہاتھوں مجبور تھی اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ آزاد ہو کر فاشزم کا مقابلہ کرتی۔

اسی بے بسی کا ردعمل تھا جو "مشرق" میں ظاہر ہوا اور پوری تلخی کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے جو مشرق کی تاریخی عظمت کا گن گاتے تھے تم نے مشرق کو ایک نئے روپ میں پیش کیا اور کہا دیکھو یہ ہے تمھارا مشرق ؎

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکان
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مسان
پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول
ایک مرگِ بے قیامت، ایک بے آواز ڈھول
اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

لیکن شاعر مایوس نہیں ہے، وہ جانتا ہے کہ ہر رات، وہ شبِ ہجراں ہی کیوں نہ ہو، اپنے بطن میں ایک نئی صبح کی پرورش کرتی رہتی ہے اور اسے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ ؎

اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

کیسے؟ کب اور کہاں؟ یہ تو اُسے خود بھی نہیں معلوم لیکن وہ انسانی ارتقاء پر بھروسہ رکھتا ہے۔ عوام اور ان کی بڑھتی ہوئی قوت پر اعتماد کرتا ہے۔ شائد اسی بناء پر وہ اس خیال کو، اس مستقبل پسندی کو، اکثر دُہرایا کرتا ہے اور جب بے بسی کا احساس تیز ہوتا ہے، ذہنی بغاوت کو تعمیر کی راہ نہیں ملتی، غلامی کی زنجیریں زیادہ کسنے لگتی ہیں یا "شوق کی بلندی اور ہمت کی پستی" میں تصادم ہونے لگتا ہے تو اس آگ کو بجھانے کے لئے جو سماجی اور سیاسی پابندیوں کے باعث شاعر کے دل میں بھڑک رہی ہے وہ تاراج یعنی دہشت پسندی — ادبی دہشت پسندی — کا شکار ہو جاتا ہے، ستارہ تخریب کی قصیدہ خوانی کرنے لگتا ہے ؎

پھونک دو قصر کو گر کُن کا تماشہ ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

کتنی گھن گرج ہے اس شعر میں! کتنا زور ہے، کتنی پیغمبرانہ خود اعتمادی ہے مگر جذبات کے اس سیلاب میں جنوں کی حد تک بڑھے ہوئے خلوص کے طوفان میں عقل کی کشتی کا دُور دُور پتہ نہیں۔ "موت کا گیت" بڑا سامعہ نواز ہے سن کر خون میں اُبال پیدا ہوتا ہے لیکن جب اسے خرد کی کسوٹی پر کسو تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موت سے لذت لے رہا ہے۔ تمہاری اس دور کی کئی نظموں کا مرکزی خیال — اگر میں غلطی نہیں کرتا — تو یہی ادبی دہشت پسندی ہے لیکن تمہاری

شاعری کا یہ دور زیادہ دن تک نہیں رہا۔ عقل اور جنون میں جلد ہی ہم آہنگی ہوگئی "قمر" غالباً اس امتزاج کی یادگار ہے دو تین شعر سنو جن میں حسن کے دو پہلو زندگی کے دو رُخ دکھائے گئے ہیں ؎

حیات نو مجھے آواز دے رہی ہے سنو
دبی زبان میں کچھ گنگنا رہا ہے قمر

اداس رات ہے، افلاس ہے، غلامی ہے
کفن سے منھ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

کہاں ہے ساقی گلرو کہاں ہے "سرخ شراب"
فسانہ غم گیتی سنا رہا ہے قمر

یہ وہ زمانہ تھا جب نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ سارے ملک میں بیداری کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ عوامی قوتیں ابھر رہی تھیں، طبقاتی جد وجہد بڑھ رہی تھی۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے نئی آن بان سے فضا میں بلند کیے جا رہے تھے۔ کسان اور مزدور اپنے حقوق منوانے کے لئے اُٹھ رہے تھے۔ وہ آرزوئیں وہ ارمان جنھیں ہندستانی قوم نے مدتوں خون جگر پلا پلا کر پالا تھا اب پروان چڑھنے والے تھے۔ غالباً انھیں حالات سے متاثر ہو کر تم نے کئی قومی نظمیں لکھیں جن میں مجھے "ہندستان کی جے" سب سے زیادہ پسند ہے شائد اس وجہ سے کہ اس کے ساتھ بعض بڑی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ طلبا کے جلسے اور ان میں تمھارا اس نظم کو کورس کی شکل میں گانا ایک سماں بندھ جاتا تھا ؎

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردار آزادی وطن کا پاسباں وہ تیغ جوہر دار آزادی

انھیں دنوں کسان اور جاگیردار کی کشمکش، آقا اور غلام کی کشمکش پر تم نے ایک چھوٹی سی نظم لکھی تھی جس کا عنوان اب تو "دھواں" ہے لیکن اس وقت کچھ اور تھا اس نظم کی شان نزول اور اس کا عنوان میرے سوا بہت کم لوگوں کو معلوم ہے یہ راز، راز ہی رہے تو اچھا ہے ؎

ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں میری چشمِ گنہگار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں ہیں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

لیکن بہت دن نہ گذرے تھے کہ میت کے اس دھوئیں پر جنگ کے بادل چھانے لگے اور یورپ کی فضا تیرہ و تار ہو گئی۔ رجعت پسند طاقتیں جو اب تک سوویت یونین کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں لگی تھیں خود ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں سرمایہ داری نظام سخت بحران میں مبتلا ہو گیا اپنے دانتوں سے اپنی بوٹیاں نوچنے لگا۔ "زلف چلیپا" کے دو شعر سنو ؎

زرگری کا رقص ہے سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچہ میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے
برہمی زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی ایسی۔ برہمی دیکھی نہ تھی

سامراجی جنگ کے دور میں مشکل سے آدھی درجن ایسی نظمیں کہی گئی ہوں گی جن سے اس جنگ کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہو۔ تم نے اس دور میں غالباً تین چار نظمیں کہی ہیں۔ "زلف چلیپا"، "سپاہی" اور "رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری"۔ "سپاہی میں سپاہیانہ شان نہیں نہ "جنگجویت" ہے

اور نہ خود اعتمادی البتہ افسردگی اور فتادگی ہے، پھر بھی اس کی سادگی اور استعارے اور محاکات کی ندرت قابل داد ہے ؎

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسے ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خون ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جنگ کا ایسا نقشہ نظر سے بہت کم گذرا ہے۔

فنی اعتبار سے "رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری" میرے خیال میں تمہاری بہترین نظموں میں سے ہے۔ افسوس ہے کہ وہ نظم اس وقت یہاں موجود نہیں البتہ آخری شعر یاد ہے ؎

رات کے ہاتھ یہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

ان فنی موشگافیوں سے قطع نظر کر کے تمہیں ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں تمہیں معلوم ہے کہ وہ کونسی نظم ہے جس نے تمہیں ہندستان کے عوام کا ایک محبوب اور مقبول شاعر بنا دیا ہے، لاکھوں کسانوں اور مزدوروں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس نظم کا لکھنے والا کون ہے، لیکن جلسوں کی جو روداد یہاں آتی ہے اس میں اکثر لکھا ہوتا ہے کہ جلسہ کی کارروائی "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" سے شروع ہوئی جسے پانچ لڑکوں کے ایک جتھے نے، دس لڑکیوں کی ایک ٹولی نے مل کر گایا شاید خود نامہ نگار کو بھی اس کی خبر نہیں کہ یہ نظم مخدوم کی ہے قبول عام کی یہ سند ہزاروں ادبی تنقیدوں پر بھاری ہے میں نے خود ایسے کئی جلسوں میں شرکت کی ہے اور جب گانے والوں کی ٹولی اس بند پر پہنچی ہو کہ ؎

لو سُرخ سویرا آتا ہے   آزادی کا آزادی کا

گلنار ترانا گاتا ہے   آزادی کا آزادی کا

دیکھو پرچم لہراتا ہے   آزادی کا آزادی کا

تو اکثر ایسا ہوا ہے کہ جلسہ کے مختلف گوشوں سے یہی مصرعے دہرائے گئے ہیں اور سننے والے خود سنانے والوں میں بدل گئے ہیں۔

پرسوں ہم نے استالن کی ۶۴ ویں سالگرہ جانتے ہو کس طرح منائی؟ تمہاری شاہکار نظم "استالن کی آواز" پڑھ کر —— اس نظم میں تمہاری شاعری اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ —— اپنے بے پناہ خلوص، اپنی بڑھی ہوئی صداقت پسندی اور خود اعتمادی —— "جلوہ افروز" ہوئی ہے تمہاری یہ نظم انقلابی حقیقت پسندی کی بہت اچھی مثال ہے پڑھو تو سارے بدن میں بجلی سی دوڑ جاتی ہے، قوت ارادی انگڑائی لے کر اٹھتی ہے اور عمل کے بازوؤں پر پرواز کرنے لگتی ہے' ان مصرعوں میں ہم کو پوری زندگی کا پیام دیا گیا ہے ؎

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں

کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں

کیا مجاہانہ بنوں ؟

کل ایک صاحب سے تمہاری شاعری پر بحث ہوئی انھیں تمہاری فنی خامیاں بہت کھٹکتی ہیں، میں نے کہا آپ کا ارشاد بجا و درست، مخدوم الفاظ کے انتخاب میں احتیاط نہیں برتتے، بعض اوقات بندشیں ڈھیلی ہوتی ہیں محاورے بھونڈے ہوتے ہیں ان خامیوں کے باوجود آپ کو مخدوم کی جدت فکر، ادبی صداقت، اور خلوص اور خود اعتمادی سے تو انکار نہیں ہو سکتا ہے تو اُس کے "سن سال کا عمل" ہے فنی خامیاں تو خشک پتیوں کی طرح تھوڑے دنوں میں خود ہی جاتی رہیں گی۔

تمہارا

سبط حسن

طور

یہیں کی تھی محبّت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جراءت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و انداز حیا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

دلوں میں ازدحام آرزو لب بند رہتے تھے

نظر سے گفتگو ہوتی تھی دَمِ اُلفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

وہ کیا آنا کہ گویا دور میں جامِ شراب آتا
وہ کیا آنا رنگیلی راگنی رنگیں رباب آتا
مجھے رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں سحاب آتا
لبوں کی مے پلانے جھومتا مست شباب آتا

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

حیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پہ لغزشیں ہوتیں

فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
ربابِ دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں
خفائے راز کی پرلطف باہم کوششیں ہوتیں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا ہیں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکر فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی

سرورِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھولاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آب رواں باقی
مگر اس عشقِ رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

ساگر کے کنارے

مندر میں پجاری لگے ناقوس بجانے
وہ انکے بھجن پیارے وہ گیت انکے سہانے
تاریکی شب اوڑھ کے رخصت ہوا عصیاں
تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے
وہ چھاؤں ہیں تاروں کی وہ کھیتوں کے کنارے
دہقان بھی بھیروں کی لگا تان اڑانے

کوئل نے کسی کنج سے کو کو کی صدا دی
مرغانِ چمن گانے لگے صبح کے گانے
انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی
ملتا ہوا آنکھیں اٹھا فتنوں کو جگانے
کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے پریں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کے بہانے
انگشتری حسن کے انمول نگینے
سرچشمۂ محبّت کے مسّرت کے خزانے
چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے
پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے

چہروں کو کبھی شرم سے آنچل میں چھپانا
گہ کھیلنا پانی سے وہ جھیپ اپنی مٹانے

تالاب پہ افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے
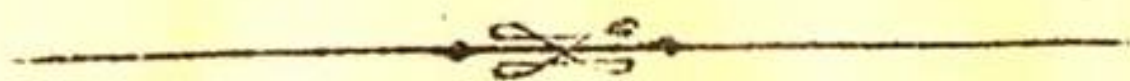
اے حسن کے تاجدار آیا آیا
اے یار اے غمگسار آیا آیا
او کار جہاں، دور ہو للہ نہ چھیڑ
ہاں ہمسفر بہار آیا آیا

تلنگن

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوئی

اجنبی کو دیکھکر خاموش مت ہو گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

ارض ہمہ تن گوش ہے خاموش ہیں سب آسماں
راگ سننے رُک گئے ہیں بادلوں کے کارواں
ہاں ترانہ چھیڑ جنگل کا میری غنچہ دہاں

اجنبی کو دیکھکر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

دیکھنے آتے ہیں تارے شب میں سن کر تیرا نام
جلوے صبح و شام کے ہوتے ہیں تجھ سے ہم کلام
دیکھ فطرت کر رہی ہے تجھ کو جھک جھک کر سلام

اجنبی کو دیکھکر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

دخترِ پاکیزگی نا آشنائے سیم و زر
دشت کی خودرو کلی تہذیبِ نو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب بام و در

اجنبی کو دیکھکر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

لے چلا جاتا ہوں آنکھوں میں لئے تصویر کو
لے چلا جاتا ہوں پہلو میں چھپائے تیر کو
لے چلا جاتا ہوں پھیلا راگ کی تنویر کو

اجنبی کو دیکھکر خاموش مت ہو گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

باغی

رعد ہوں برق ہوں بے چین ہوں پارا ہوں میں
خود پرستار خود آگاہ خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جور جلا دے وہ شرارا ہوں میں
میری فریاد پہ اہلِ دول انگشت بہ گوش
لا تبر خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

سرِ پُر نخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا
شورِ نالہ سے درِ ارض و سماں توڑوں گا
ظلم پرور روشِ اہلِ جہاں توڑوں گا
عشرتِ آبادِ امارت کا مکاں توڑوں گا

توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عُسرت سے چھڑانے دے مجھے
برق بن کر بُتِ ماضی کو گرانے دے مجھے
رسمِ کہنہ کو تہِ خاک مِلانے دے مجھے
تفرقے مذہب و ملّت کے مٹانے دے مجھے
خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے
آگ ہوں آگ ہوں ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ بس اب آگ لگانے دے مجھے

آسمانی لوریاں

روزِ روشن جا چکا ہے شام کی تیاریاں
اُڑ رہی ہیں آسماں پر زعفرانی ساریاں
شام رخصت ہو رہی ہے رات کا منہ چوم کر
ہو رہی ہیں چرخ پر تاروں میں کچھ سرگوشیاں
جلوے ہیں بے تاب پردے سے نکلنے کیلئے
بن سنور کر آ رہی ہیں آسماں کی رانیاں

نوعروسِ شب نے پہنا ہے لباسِ فاخرہ
آسمانی پیرہن میں کہکشانی دھاریاں

کارچوبی شامیانے میں رچی بزمِ نشاط
ساز نے انگڑائی لی بجنے لگی ہیں تالیاں

لاجوردی فرش پر ہے مشتری زہرہ کا رقص
نیل تن کرشن کے پہلو میں مچلتی گوپیاں

دست و پا کی نرم و خوش آہنگ ہلکی جنبشیں
یا فضا میں ناچتی ہیں گنگناتی بجلیاں

سرمدی نغمات سے ساری فضا معمور ہے
نطقِ ربِّ ذوالمنن ہیں رات کی خاموشیاں

نیند سی آنکھوں میں آتی ہے جھکا جاتا ہے سر
سن رہا تھا دیر سے میں آسمانی لوریاں
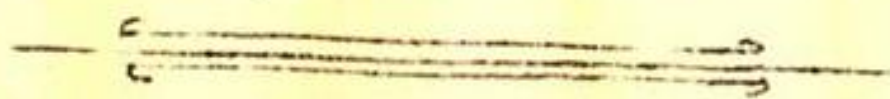
سجدہ

پھر اُسی شوخ کا خیال آیا
پھر نظر میں وہ خوش جمال آیا

پھر تڑپنے لگا دلِ مضطر
پھر برسنے لگا ہے دیدۂ تر

یاد آتی ہیں وہ چاندنی راتیں
وہ ہنسی چھیڑ دل لگی باتیں

شب تاریک ہے خموشی ہے
کُل جہاں محوِ عیش کوشی ہے

لطف سجدوں میں آ رہا ہے مجھے
چھپ کے کوئی بلا رہا ہے مجھے

چوڑیاں بج رہی ہیں ہاتھوں کی
آئی آواز اس کی باتوں کی

اڑ رہا ہے غبارِ نورِ بدن — پھیلتی جا رہی ہے بوئے بدن

موجِ تسنیم و کیفِ خلدِ بریں — جگمگاتا بدن چمکتی جبیں

اپنے آنچل میں منہ چھپائے ہوئے — آ رہا ہے قدم بڑھائے ہوئے

نغمے پازیب کے سناتے ہوئے — بختِ خفتہ میرے جگاتے ہوئے

عشوہ و ناز کا فسوں لے کر — ساتھ اک لشکرِ جنوں لے کر

دور سے مُسکراتا آتا ہے — بجلیاں سی گراتا آتا ہے

وہ کہ رنگیں کرن تبسّم کی — اِک مسلسل لڑی ترنّم کی

پردۂ تن میں راگ پوشیدہ — راگ وہ جس میں آگ پوشیدہ

بانسری سی بجائے جاتا ہے — آگ تن میں لگائے جاتا ہے

ایک دنیائے رنگ و بو بن کر — خوں شدہ دل کی آرزو بن کر

نئی دلہن کی تھرتھری بن کر — اُس کے ہونٹوں کی کپکپی بن کر

میرے دل میں سما گیا کوئی — میری ہستی پہ چھا گیا کوئی

لمحۂ رخصت

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنّا باہوں میں
مشتاق نگاہوں کی زد سے نظروں کا حیا سے جھک جانا
اک شوق ہم آغوشی پنہاں اُن نیچی بھیگی پلکوں میں
شانے پہ پریشاں ہونے کو بے چین سیہ کاکل کی گھٹا
پیشانی میں طوفاں سجدوں کا لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں

وارفتہ نگاہوں سے پیدا ہے ایک ادائے زلیخائی
اندازِ تغافل تیور سے رُسوائی کا ساماں آنکھوں میں
فرقت کی بھیانک راتوں کا رنگین تصور میں آنا
افشائے حقیقت کے ڈر سے ہنس دینے کی کوشش ہونٹوں میں
آنسو کا ڈھلک کر رہ جانا خوں گشتہ دلوں کا نذرانہ
تکمیل وفا کا افسانہ کہہ جانا آنکھوں آنکھوں میں
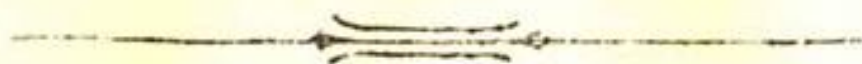
حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

جوانی

بیدار ہوئیں پھر جوانی کی شعاعیں
پڑنے لگیں عالم کی اسی سمت نگاہیں
خوابیدہ تھے جذبات بدلنے لگے کروٹ
روئے شررِ طور سے ہٹنے لگا گھونگٹ
بھرنے لگے بازو تو ہوئے بندِ قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

ساغر کی کھنک بن گئی اُس شوخ کی آواز
بربط کو ہوئی گدگدی یا جاگ اُٹھے ساز

اعضا میں لچک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں
اعصاب میں پارہ ہے تو بجلی ہے نظر میں

آنے لگی ہر بات پہ رک رک کے ہنسی اب
رنگین تموج سے گراں بار ہوئے لب

وہ دیکھ بدلتے ہوئے پہلو کوئی اٹھا
وہ دیکھ بگاڑے ہوئے گیسو کوئی اٹھا

وہ دیکھ کہ کس گل کی مہک پھیلی ہے ہر سو
وہ دیکھ کہ ہے کون رواں بجتے ہیں گھنگرو

کم بخت اجل تھی یہ جوانی کی قبا میں
ٹکڑے ہیں کسی دل کے بھی نقش کف پا میں
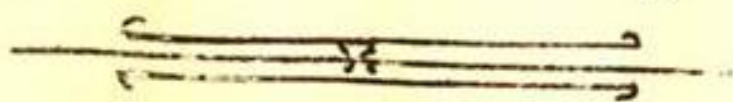
یاد ہے

کھیلتا تھا جب لڑکپن سے ترا رنگیں شباب
ہٹ رہی تھی ماہِ عالم تاب کے رخ سے نقاب
زندگی تھی حسنِ نو آغاز کا رنگین خواب

یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

جب کہ سازِ زندگی نغمات سے معمور تھا
ذرّہ ذرّہ میرے دل کی خاک کا جب طور تھا

میں اکیلا ہی نہیں سارا جہاں مسرور تھا

یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

کھیلتی تھی نوجوانی جب کہ باہوں میں تیری
زندگی کی بارشیں تھیں جلوہ گاہوں میں تیری
رقص کرتی تھیں تمنائیں نگاہوں میں تیری

یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

ہر ادائے حُسن پر ہوتا تھا دل جب بے قرار
جب رہا کرتا ملاقاتوں کا باہم انتظار
جب طبیعت تجھ سے ملنا چاہتی تھی بار بار

یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

رات بھر سونے نہ دیتی تھی مسرّت عید کی
جبکہ رہتی تھی دلوں میں بے قراری دید کی

ماہتاب عید بن جاتی کرن خورشید کی
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

رات آتی تھی سنانے سوز کا پیغام جب
مشق تحریر جنوں بنتا تھا تیرا نام جب
تھا نہ کچھ پیش نظر اس عشق کا انجام جب
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

بات کیا تھی ذکر کس کا تھا کہ ہنگام نشاط
مسکرانے والی آنکھیں، ہچکیاں لینے لگیں

تھک کے رہ جاتے ہیں استدلال کے جس جا قدم
ٹوٹ جاتا ہے پہنچ کر جس جگہ منطق کا قدم

خواب عقل و ہوش کی مجہول تعبیروں سے دور
فلسفی کی کس طرح اور کیوں کی زنجیروں سے دور

میرے رہنے کا جہانِ جاودانی اور ہے
دل کی دنیائے نہاں کی زندگانی اور ہے

خود تراشیدہ بتِ ناز آفریں میرا وجود
میری ذاتِ پاک مسجودِ جہانِ ہست و بود
دوسرا کوئی نہیں رہتا جہاں رہتا ہوں میں
اپنے سیلابِ خودی میں آپ ہی بہتا ہوں میں
میرے سجدوں کے لئے ہی وقف ہے میری جبیں
میری اقلیم انا میں دوسرا کوئی نہیں
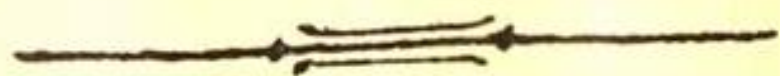
میری آنکھوں کی زباں اور مرے دل کی آواز
نہ سمجھنے کے لئے ہے نہ سنانے کے لئے

کچھ قوسِ قزح سے رنگت لی کچھ نور چرایا تاروں سے
بجلی سے تڑپ کو مانگ لیا کچھ کیف اڑایا بہاروں سے

پھولوں سے مہک شاخوں سے لچک اور منڈوؤں سے ٹھنڈا سایہ
جنگل کی کنواری کلیوں نے دے ڈالا اپنا سرمایہ

بدمست جوانی سے چھینی کچھ بے فکری کچھ الہڑپن
پھر حسنِ جنوں پرور نے دی آشفتہ سری دل کی دھڑکن

بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے اک اپنا گیت بناتا ہوں
فردوسِ خیالی میں بیٹھا اک بت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں
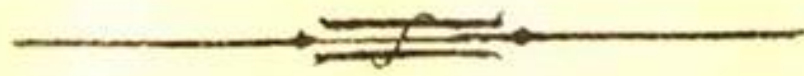
دشمن!

کوئی تالو میں مری بیٹھ کے چلّاتا ہے
ڈنک پر ڈنک لگاتا ہے مرے دل کے قریب
آگے بڑھتا ہوں تو قدموں سے چمٹ جاتا ہے
مجھے جانے ہی نہیں دیتا ہے منزل کے قریب

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچی کئے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

آگئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غمخانہ میں شہنائی سی
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اِک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب میری نیند اڑانے والے
میرے مسجود میری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تا کہ مِرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

پچھلے پہر کے چاند سے

لذتِ آغوشِ شب سے تھک گیا ہے ماہتاب
رات کی رانی نے اس سے چھین لی روحِ شباب
لڑکھڑاتا اونگھتا ہے جانبِ مغرب رواں
زرد چہرے پر عیاں لب ہائے لیلیٰ کے نشاں
رندِ شب بیدار جا سو جا سیاہی اوڑھ کر
خوابِ شیریں کے مزے لے پہلوئے شب چھوڑ کر
موت تیری زندگی مہر کا پیغام ہے
مرمریں دستِ سحر میں دیکھ رنگیں جام ہے

برسات

ان مست ہواؤں کا یہ برسات کا موسم
تنہائی میں بے یار گذر جائے ستم ہے
شغل مئے و محبوب کا رنگین زمانہ
کالج کی خرافات میں کٹ جائے ستم ہے
آغاز جوانی کے گناہوں کا تقدس
اوراقِ دفتر بے معنی میں دب جائے ستم ہے

جس پیکرِ لذت سے عبارت ہی مسرّت
وہ ہمدمِ دیرینہ بچھڑ جائے ستم ہے
نوخاستہ محبوب کا منہ چومنے والے
اس رُت میں یہ بے بال و پری ہائے ستم ہے
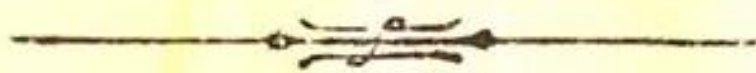
تو نے کس دل کو دُکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کس صنم خانہ کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

اِنتساب

ہم کو بے مائگی ضبط دکھانا ہی پڑا
دل کی باتوں کو ترے سامنے لانا ہی پڑا
میں جو خلوت میں بھی ڈرتا تھا سنانے کیلئے
سر بازار وہی گیت سنانا ہی پڑا
کھینچ لایا تجھے پردے سے مرا ذوقِ نیاز
میرے پردے میں تجھے جلوہ دکھانا ہی پڑا
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سہی دھڑکتے دل سے
تیرے رخ سے تیرے آنچل کو ہٹانا ہی پڑا

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پھر شمعِ زندگی؟
پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثارِ بیوگی؟
عفریتِ سیم و زر کے کلیجے میں کیوں ہے پھانس؟
کیوں رک رہی ہے سینہ میں تہذیبِ نو کی سانس؟

امن واماں کی نبض چھٹی جا رہی ہے کیوں؟
بالینِ زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں؟

اب دلہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ

ربط نواز بزم الوہی ادھر تو آ
دعوت دہِ پیامِ عبودی ادھر تو آ

انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسماں والے کی بیداریاں تو دیکھ

معصومۂ حیات کی بیچارگی تو دیکھ
دستِ ہوس سے حسن کی غارت گری تو دیکھ

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی

انسان رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے
اس فتنہ زا زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے

او آفتابِ رحمتِ دوراں طلوع ہو
او انجمِ حمیتِ یزداں طلوع ہو
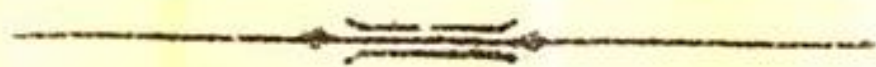
گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا
تری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا

جنوں کی لغزشیں خود پردہ دارِ راز الفت ہیں
جو کہتے ہو سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

مشرق

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری نجاست کا مکان
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مسان

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جسکے اس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریض دق کو دیکھ

ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول
ایک مرگِ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا
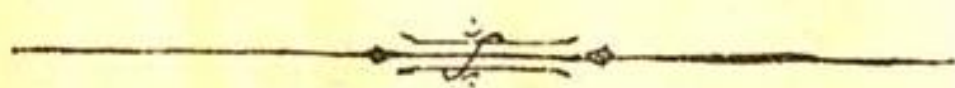
موت کا گیت

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں
ظلمتِ کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں

سگِ خونخوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں

جاگ اٹھنے کو ہے اب خوں کا تلاطم دیکھو
ملک الموت کے چہرے کا تبسّم دیکھو

جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں

دَورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
رُوحِ انسان کو آزاد کیا جائے گا

نالۂ بے اثر اللہ کے بندوں کے لئے
صلۂ دار و رسن حق کے رسولوں کیلئے
قصرِ شدّاد کے دربند ہیں بھوکوں کیلئے

پھونک دو قصر کو گر کُن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاوو آؤ
بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ

آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاشِ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

دھواں

جنتیں خاک پہ جس رات اتر آئی تھیں
بدلیاں رحمتِ یزداں کی جہاں چھائی تھیں
عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روحِ جہاں بانی تھی
ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں میری چشم گنہگار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

محبّت کی چھاؤں

ہم محبت کی چھاؤں میں سوتے تھے جب
خار بھی پھول معلوم ہوتے تھے جب
ابتدائے جنوں کی وہ اک بات تھی
وہ محبت کی تاروں بھری رات تھی
دل کے تاروں سے مضراب ٹکرا گیا
سرتشیں لے اٹھی کیف سا چھا گیا

حسن کا وار جو تھا وہ بھرپور تھا
جس کو دیکھا نظر بھر کے وہ طور تھا

دل کو اکبار سب دھو گئیں بجلیاں
میری رگ رگ میں حل ہو گئیں بجلیاں

دردِ دل کا بہانہ بنی دل لگی
آنسوؤں کا فسانہ بنی دل لگی

پل کے پل میں بدلنے لگی زندگی
غم کے سانچوں میں ڈھلنے لگی زندگی

چاہ کا دن ڈھلا شام ہونے لگی
دل دھڑکنے لگا آنکھ رونے لگی

رات اور دن یونہی آتے جاتے رہے
حسن اور عشق تکمیل پاتے رہے

نامۂ حبیب

کہا ہی مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواوں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

کہ تم کو حُسن کی نامہربانی سے شکایت ہی
تمہیں کچی کلی کی بے زبانی سے شکایت ہی
گنہ ناآشناؤں کی جوانی سے شکایت ہی

کہا ہے مجھ سے جنگل کی ان آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

سنا ہے ضبط کو تم دل کی سنگینی سمجھتے ہو
ادائے خوف رسوائی کو خود بینی سمجھتے ہو
یہ کیا سچ ہے میرے آنسو کو رنگینی سمجھتے ہو

کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

جنوں پرور اداؤں سے سنورنے کے ارادے ہیں
خدا کے عرش الفت سے اترنے کے ارادے ہیں
زمین و آسماں کو ایک کرنے کے ارادے ہیں

کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

آزادیٔ وطن

کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے

قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی

قسم ہے خون دہقاں کی قسم خون شہیداں کی

یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں

یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں

جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے

روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی

کہو ہندوستاں کی جے ——— کہو ہندوستاں کی جے

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردار آزادی
وطن کا پاسباں وہ تیغ جوہر دار آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
وہ شمع زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ بر اندام رہتی ہے

وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے
چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی

مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے
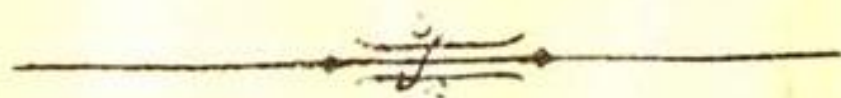
جہانِ نو

نغمے شرر فشاں ہوں اٹھا آتشیں رباب
مضراب بے خودی سے بجا سازِ انقلاب
معمارِ عہدِ نو ہو تیرا دستِ پُر شباب
باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

وِلی

جہانِ رنگ و بو سے کھیلنے والا نہ تھا کوئی
شبِ ہجراں کی سختی جھیلنے والا نہ تھا کوئی

زبانِ نغمہ بے تاثیر تھی مستی کی پیاسی تھی
پریشاں گیت تھے گیتوں کے چہرے پر اداسی تھی

ترانے حسن و دل کے گانے والا ہی نہ تھا کوئی
حسیں فطرت کا جی بہلانے والا ہی نہ تھا کوئی

اِک اپنی ترجمانی چاہتے تھے رازِ فطرت کے
کسی داؤد کے محتاج تھے سب سازِ فطرت کے

ابھی نا آشنائے لذّتِ گفتار تھی دُنیا
اَسیرِ خاموشی تھی بار تھی آزار تھی دُنیا

یکایک دہرِ تیرہ بخت کی قسمت بدلتی ہے
ہوا بھی زیرِ لب ہنستی ہوئی اتراتی چلتی ہے

پگھل کر بہہ چلے موسیقیوں کے منجمد دھارے
اٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے بستر سے فوارے

وہ پیغامِ سحر آ ہی گیا زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ اُبھرا ابھر لو وہ زندگانی کی کرن پھوٹی

حجابِ تیرگی قدرت نے جب چٹکی سے سرکایا
تو گہوارے میں اک ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا

فضائیں احتراماً سر پہ آنچل ڈال لیتی ہیں
سحر کی بیٹیاں رنگینیوں کی ناؤ کھیتی ہیں

صدا دی آسمانوں نے ستاروں نے ولی آیا!
مبارکبادیاں گائیں بہاروں نے ولی آیا!

ولی وہ ہمدمِ فطرت وہ پیکِ نورِ وجدانی
وہ جبریلِ سخن وہ اولیں تلمیذِ رحمانی

یقیں بخشا زباں کو جس نے پہلے اسکے جینے کا
وہ پہلا ناخدا ہندوستانی کے سفینے کا

دیئے روشن کئے مندر میں کعبہ کے چراغوں سے
ہزاروں جنتیں آباد کر دیں دل کے داغوں سے

وہ میراثِ جہاں وہ خلد کا پیغام آتا ہے
دکن کی سرزمیں پر زندگی کا جام آتا ہے
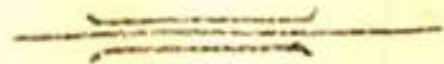
اقبال

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا؟
جانب مشرق اجالا سا نظر آنے لگا؟
موت کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں چھٹنے لگیں
ظلمتوں کی چادریں ہٹنے لگیں ہٹنے لگیں
ایک شرارہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا
آسماں کے نور بیکر نوجوانوں تک گیا

عالمِ بالا پہ باہم مشورے ہونے لگے
آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے

پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا!
زندگی کے موڑ پر گاتا ہوا پایا گیا!

وہ نقیبِ زندگی شام و سحر گاتا گیا
کوبہ کو کوچہ بہ کوچہ دربدر گاتا گیا

گیت سُننے کے لئے خلقِ خدا آنے لگی
گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی

نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں
صُورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

عرش کی قندیل ہے اِک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

ٹوٹے ہوئے تارے

کہا ہے مجھ سے یہ ٹوٹے ہوئے ستاروں نے
فلک کی گود سے چھوٹے ہوئے ستاروں نے
نولٹے درد مری کہکشاں میں ڈوب گئی
وہ چاند تاروں کے سیلِ رواں میں ڈوب گئی
سمن برانِ فلک نے سحر کو دیکھ لیا
زمین والوں کے دل کو نظر کو دیکھ لیا

وہ میری آہ کا شعلہ تھا کوئی تارہ نہ تھا
وہ خاکداں کا مسافر تھا ماہ پارہ نہ تھا

دلوں میں بیٹھ گیا تیر آرزو بن کر
فلک پہ پھیل گیا عشق کا لہو بن کر

یہ ساکنانِ فلک درد و غم کو کیا جانیں؟
یہ خاکیوں کی رہِ بیش و کم کو کیا جانیں؟

وہ غم کو پی تو گئے آنسوؤں کو پی نہ سکے
زمیں کے زہر کو پی کر وہ اور جی نہ سکے

فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کے تارے
زمیں پہ ڈھیر ہوئے تیر آہ کے مارے

یہ آگ اور بھی اوپر نکل گئی ہوتی
حریمِ عرش کو چھو کر نکل گئی ہوتی!

قلندر

چغتائی کی تصویر "قلندر" کو دیکھ کر

تری نظروں کی زد کو آسماں والوں سے پوچھوں گا
مکاں والوں سے کیا، میں لامکاں والوں سے پوچھونگا
ہنرور کو صلہ صنعت گری کا مل گیا ہوگا
قلندر کی نظر کو دیکھ کر دل ہل گیا ہوگا
جنوں کو عام کر دے دہر کو زیر و زبر کر دے
انہیں بے باک نظروں کو ذرا بے باک تر کر دے

غلط آہنگ ساز زندگی برباد ہو جائے
جہانِ نغمہ قیدِ ساز سے آزاد ہو جائے
ترار قصِ جنوں ہم سازِ اسرافیل ہو جائے
یہ بزمِ غیر بزمِ خاص میں تبدیل ہو جائے

مسیحا دم گلِ فردوس کھلتا جا مہکتا جا
حرم کی لاش پر داؤد کے نغمے چھڑکتا جا

اِقبال کی رحلت پر
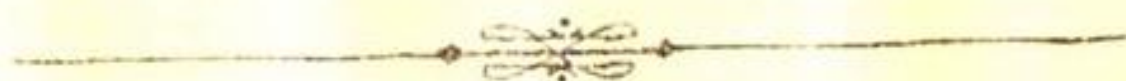
جِس رَہ نوردِ شوق کو منزل سے عار تھا
جِس موجِ بے قرار کو ساحل سے عار تھا
کِس کی نظر نے اُس کو نظر بند کر دیا؟
اُس برقِ جاں نواز کو پابند کر دیا
شُعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سو گیا
اُمت کا شب چراغ اندھیرے میں کھو گیا

پُرسہ
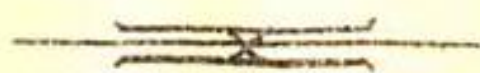
بچہ کے انتقال پر ماں کے حضور میں

نہ رو ہم نشیں یہ جہاں اور ہی ہے
یہاں کی رہِ امتحاں اور ہی ہے
ترے دل کی ٹھنڈک کو تاروں میں ڈھونڈا
ترے پھول کو مرغزاروں میں ڈھونڈا
ترے آنسوؤں کے چراغوں سے ڈھونڈا
ترے دل کے نوخیز داغوں سے ڈھونڈا

بہاروں کو لوٹانے والی ہوائیں
نہ تیری ہوائیں نہ میری ہوائیں
مرادوں کو بر لانے والی دعائیں
نہ تیری دعائیں نہ میری دعائیں

دعائیں بھی بے بس ہوائیں بھی بے بس
تیری اور میری التجائیں بھی بے بس

نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی
ازل کے مصوّر کا ہر نقش فانی

وہ

وہ خمِ گردن وہ دستِ ناز وہ ان کا سلام
ابروؤں کا وہ تکلّم وہ نگاہوں کا پیام

بولتی آنکھوں کا رس گلرنگ عارض کا جمال
مسکراتا سا تصور گنگناتا سا خیال

ایک ایسا غم جو آنسو بن کے بہہ سکتا نہیں
دِل جسے محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں

اور کیا ہوگی کسی کی کائناتِ سال و سن
عشق کی دو چار راتیں حسن کے دو چار دن

آہ پہلے نارسا تھی اب کہیں رکتی نہیں
اب کسی کے آستانہ پر جبیں جھکتی نہیں

ہر طرف پھیلی ہوی ہے چاندنی ہی چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں انکی جوانی ساتھ ہے

نورس

وہ پہلا گیت بہاروں کا
وہ ارماں چاند ستاروں کا

جبریل امیں کے ہونٹوں کے
بے گائے ہوئے نغموں کی صدا

معصوم لڑکپن کے رُخ پر
نوخیز جوانی کا غازہ

حوروں کے بہشتی نغموں سے
جو راگ بنے وہ راگ ہے وہ

جس سے کہ کلیمی ملتی ہے
کچھ ایسی ہی اِک آگ ہے وہ

تاروں کی محفل سے آکر
کلیوں میں سو جانے والی

روشن سورج کی کرنوں کے جھرمٹ میں کھو جانے والی
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں یہ کہنے کی ہمت ہو نہ سکی
اظہارِ تمنّا ہو نہ سکا اظہار کی جرأت ہو نہ سکی

آ شاعر کے من میں آ جا
آ اپنے نشیمن میں آ جا

حویلی
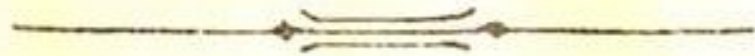
ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر
مار و کژدم کا ٹھکانا جسکی دیواروں کے چاک
اُف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک

جن میں رہتے ہیں مہاجن جن میں بستے ہیں امیر
جن میں کاشی کے برہمن جن میں کعبے کے فقیر

رہزنوں کا قصر شوریٰ۔ قاتلوں کی خوابگاہ
کھل کھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ

جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا

زیست کو درسِ اجل دیتی ہے جسکی بارگاہ
قہقہہ بن کر نکلتی ہے جہاں ہر ایک آہ

سیم و زر کا دیوتا جس جا کبھی سوتا نہیں
زندگی کا بھول کر جس جا گذر ہوتا نہیں

ہنس رہا ہے زندگی پر اسطرح ماضی کا حال
خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال

ایک جانب ہیں وہ ہیں اُن بے نواؤں کے گروہ
ہاں انہیں بے نان و بے پوشش گداؤں کے گروہ

جن کے دل کچلے ہوئے جنکی تمنّا پائمال
جھانکتا ہے جنکی آنکھوں سے جہنّم کا جلال

اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے
دیکھ تیرے ہاتھ کا شہ کار کس منزل میں ہے

جانتا ہوں موت کا ہم ساز و ہمدم کون ہے
کون ہے پروردگارِ بزمِ ماتم کون ہے

کوڑھ کے دھبّے چھپا سکتا نہیں ملبوسِ دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اے جوانِ سالِ جہاں جانِ جہانِ زندگی
ساربانِ زندگی روحِ روانِ زندگی

جسکے خون گرم سے بزم چراغاں زندگی
جسکے فردوسی تنفس سے گلستاں زندگی

بجلیاں جسکی کنیزیں زلزلے جس کے سفیر
جسکا دل خیبر شکن جسکی نظر ارجن کا تیر

ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی
تو بجائے ساز الفت اور گائے زندگی

آ انہیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھولدیں
آ انہیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھولدیں
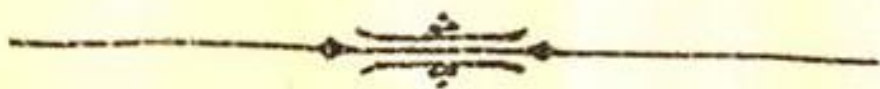
مُسافر

ترے ہمرہی کھو گئے رے مسافر   مسافر چلے چل
نہ جانے وہ کیا ہو گئے رے مسافر   مسافر چلے چل

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل
مسافر
چلے چل چلے چل چلے چل چلے چل

اندھیرے میں اب ساتھ کیا دیکھتا ہے   دیا بجھ گیا ہے
بہرحال چل رات کیا دیکھتا ہے   دیا بجھ گیا ہے

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل
مسافر
چلے چل چلے چل چلے چل چلے چل

سمجھ موت کی وادیوں سے گذرتا چلا جا رہا ہے
سحر کے تعاقب میں گرتا اُبھرتا چلا جا رہا ہے

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل
مسافر
چلے چل چلے چل چلے چل چلے چل
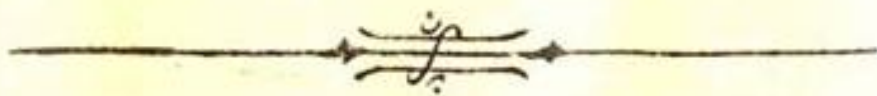
آ تا مری دنیا کو خرابات بناتا
آنکھوں سے پلاتا کبھی ہونٹوں سے پلاتا

مستقبل

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

دھڑکتے دلوں کی صدا آ رہی ہے
اندھیرے میں آوازِ پا آ رہی ہے
بلاتا ہے کوئی ندا آ رہی ہے

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

نہ سلطانیٔ تیرگی ہے نہ زاری
نہ تختِ سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

اڑاتا ہوا پرچمِ زندگانی
سناتا ہوا عہدِ نو کی کہانی
جِلَو میں ظفرمندیاں شادمانی

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے

چلا آرہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

خلوت رنگین میں بھی ڈستا ہی یوں دُنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

قمر

شفق کی پیٹھ کے پیچھے سے آرہا ہے قمر
زمیں پہ نور کی چادر بچھا رہا ہے قمر
درخت چاندی کے انکے ثمر بھی چاندی کے
ہراک حسیں کو حسیں تر بنا رہا ہے قمر
حیات نو مجھے آواز دے رہی ہے سُنو
دبی زبان میں کچھ گنگنا رہا ہے قمر

نگاہِ یار سے جا جا کے مل رہی ہے نگاہ
جنون و حسن کو باہم ملا رہا ہے قمر

کسی کا روئے مبیں پھر رہا ہے آنکھوں میں
رُلا رُلا کے مجھے مسکرا رہا ہے قمر

بھلا رہا تھا جسے میں فریب دے دیکر
وہی حکایت شیریں سنا رہا ہے قمر

چھپا رکھا تھا زمانے کی آنکھ سے جس کو
وہ دولتِ غمِ الفت لٹا رہا ہے قمر

فلک پہ ابر کے اڑتے ہوئے جزیروں میں
زمیں کے درد کو اوپر بلا رہا ہے قمر

یہ کس غریب کے سینہ میں ہوک اٹھتی ہے
لرز رہے ہیں محل تھرا رہا ہے قمر

اُداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے
کفن سے منہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

کہاں ہے ساقیِ گلرو کہاں ہے "سرخ شراب"
فسانۂ غمِ گیتی سنا رہا ہے قمر

اب ایسی آندھیاں آنے کو ہیں بدبخت عالم میں
قفس کا ذکر کیا، سارا چمن اڑ جانے والا ہے

روحِ فغفور

دخترِ خواجگی روحِ غارت گری
موت کی ہم سفر مرگھٹوں کی پری
جہل و افلاس کے تخت پر جلوہ گر
کچھ بچاری اِدھر کچھ بچاری اُدھر
وہ شب اندام وہ قبر کی تیرگی
میرے گھر میں وہ کل یک بہ یک گھس گئی
ناچتی کودتی شور کرتی ہوئی
میری خوشیوں سے جیبوں کو بھرتی ہوئی

پرچم غم ہوا میں نچاتی ہوئی
مسکراتی ہوئی کھِل کھلاتی ہوئی

ایڑیوں سے دلوں کو کچلتی ہوئی
خون پی پی کے گرتی اُبھرتی ہوئی

موت سے کہہ رہی تھی وہ یوں دمبدم
اے میری ہم نفس اے مری ہم قدم

ترے ترکش میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں
کونسی وہ بلا ہے جو مجھ میں نہیں

کیا مجھے جوعِ ارضی نے پالا نہیں
کیا یہ انسان میرا نوالہ نہیں

پشت گیتی پہ میں بھی تو ناسور ہوں
دیکھ تو کون ہوں روحِ فغفور ہوں
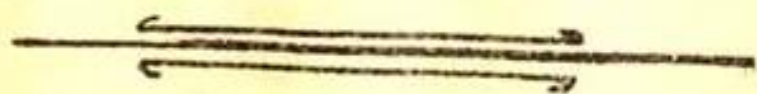
کیا کہوں کن دلبرانِ خاص کی محفل میں ہوں
کیا بتاؤں کِن نگاہوں میں ہوں کیسے دل میں ہوں
واجب و امکان کی کِس حد میں ہوں میں کیا کہوں
کیسی کیسی تجلیوں کی زد میں ہوں میں کیا کہوں
کتنے لب کتنی جبینیں کتنے جلوے کتنے طور
کتنی صبحوں کا اجالا کتنے نغموں کا سرور

کتنی نوآغاز کلیاں کتنے خوشبودار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر ہوتے ہیں رنجور وملول
کتنے سنگیں دل ہیں جو میرے نشہ میں چور ہیں
کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے مشہور ہیں
کیا کہوں کن مہوشوں کن دلبروں کا ساتھ ہے
کیا کہوں کن عارضوں کن کاکلوں کا ساتھ ہے
کیسے کیسے آتشیں پیغمبروں کا ساتھ ہے
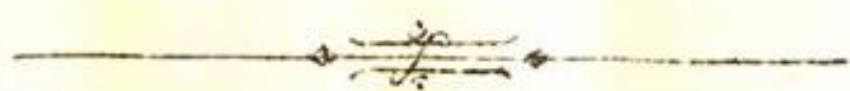
گھر

گھر کے ہر ذرّے سے ناسور کی بُو آتی ہے
قبر کی عود کی کافور کی بو آتی ہے
ہم اسیروں کی بھی اک عمر بسر ہوتی ہے
نہ تو موت آتی ہے ہمدم نہ سحر ہوتی ہے

پشیمانی

اے خوشا وہ دن کہ جب تجھ سے ملاقاتیں نہ تھیں
ایسے مشکل دن نہ تھے ایسی کٹھن راتیں نہ تھیں

جب دلِ ناداں یوں بے طرح بھر آتا نہ تھا
آتشِ غم تیز کرنے والی برساتیں نہ تھیں

شب کے سناٹے میں چپکے چپکے رو لیتا نہ تھا
آنکھ میں آنسو نہ تھے لب پہ مناجاتیں نہ تھیں

جب حریم دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

زُلفِ چلیپاَ

یہ نظم موجودہ جنگ کے سامراجی دور میں لکھی گئی

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام
آندھیاں شعلہ بداماں خون کی برسات میں
اب تو بوئے آتش و بارود ہے ہر بات میں
کتنی ماؤں کی سُہانی گودیاں ویراں ہیں آج
فرق گیتی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج

موت محوِ شادمانی، غرقِ ماتم ہے حیات
لٹ رہی ہے ساری خلقت جل رہی ہے کائنات

جس زمیں سے ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے

رام و لچھمن کی زمیں کرشن کی گوتم کی زمیں
وہ محمدؐ کی زمیں وہ ابنِ مریم کی زمیں

اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے
اسکے دل میں موت ہے اسکی نظر میں موت ہے

مندروں میں معبدوں میں اور کلیساؤں میں موت
خلوتوں میں موت ہے شاہی شبستانوں میں موت

زرگری کا رقص ہے سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچہ میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے

اب کسی سینے میں رُوحِ شادماں گاتی نہیں
زندگی کی اب کہیں ہلچل نظر آتی نہیں
برہمیِ زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی ایسی برہمی دیکھی نہ تھی
پی اور اپنے ہاتھ سے پی لے کے سرمایہ کا نام
موت کا لبریز ساغر، عصرِ حاضر کے غلام
عزمِ آزادی سلامت، زندگی پائندہ باد
سُرخ پرچم اور اُونچا ہو، بغاوت زندہ باد
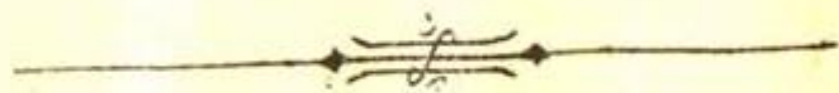
سپاہی

یہ نظم موجودہ جنگ کے سامراجی دور میں لکھی گئی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بُو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلّا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

گِر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مِری جاں سویرا
اُو وطن چھوڑ کر جانے والے
کُھل گیا اِنقلابی پھریرا

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

اِنقلاب

آنے والے نئے نظامِ عالم کے پیش رس کی تمنّائیں

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے

ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے

ہجومِ شوق سرِ رہگذار کب سے ہے

گذر بھی جا کہ ترا اِنتظار کب سے ہے

نہ تابنا کی رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرّہ ذرّہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفّن ہوائیں سب مسموم

گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

رُخِ حیات پہ کاکل کی برہمی ہی نہیں
نگار دہر میں انداز مرمی ہی نہیں
مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں

گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے

قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے ابتک
سروں میں دین کا سودائے خام ہے ابتک
توہمات کا آدم غلام ہے اب تک

گذر بھی جا کہ ترا اِنتظار کب سے ہے

ابھی دماغ پہ قحبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رُکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
شمیمِ عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار

گذر بھی جا کہ ترا اِنتظار کب سے ہے

اندھیرا

رات کے ہات میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا ــــــ کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ

وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہات کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اِس پار سے اُس پار تلک
سرد ہوا۔
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سنّاٹے میں رونے کی صدا۔
کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی

چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

جنگ آزادی

یہ جنگ ہے جنگ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی — محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی — دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے

سارا سنسار ہمارا ہے — پورب پچھم اتر دکن
ہم افرنگی ہم امریکی — ہم چینی جانبازانِ وطن

ہم سُرخ سپاہی ظلم شکن آہن پیکر فولاد بدن

یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے

وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا؟ دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دُنیا دُنیا کیا ہوگی؟ جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی، آزادی کیا ہے؟ مزدور کا جس میں راج نہ ہو

یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے

لو سُرخ سویرا آتا ہے — آزادی کا آزادی کا
گُلنار ترانہ گاتا ہے — آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے — آزادی کا آزادی کا

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی — محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی — دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ستارے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ
رات رات بھر جاگ کر
کس کو گیت سُناتے ہو

چپ چپ رہ کر، جھل مل جھل مل
کس بھاشا میں گاتے ہو

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ
رات اندھیری کالی کالی
کس سج دھج سے آئی ہے
میرا کیا ہے میں سودائی
تاروں کی رسوائی ہے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ
ہم جس نگری میں رہتے ہیں
وہ نگری کیا دیکھو گے
غم جس بستی میں بستے ہیں
وہ بستی کیا دیکھو گے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو

جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

آپ نن آساں، راج دلارے

میں وحشی طوفان بدوش

میری دنیا، جدل مسلسل

آپ کی دنیا سیل خموش

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو

جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

جھوم جھوم کر، گرج گرج کر

بادل بن کر چھاتا ہے

دھرتی کے پیاسے ہونٹوں

میں امرت رس برساتا ہے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

اِستالین

قازقستان کے نو سالہ بوڑھے تاتاری شاعر جمبول جابر کی
نظم کا آزاد ترجمہ

جابر انقلاب روس سے قبل کا انقلابی شاعر ہے۔ جس کا
رنگ آج تک بدستور قائم ہے۔ اس کی نظموں کے مجموعہ کا اٹھارہ
زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور گورکی ایسے ادیب نے اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے

صف اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر

استالین

مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا

جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں

وہ زمیں اور وہ وطن

جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو

جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق

اُن کی محنت کا اخوت کا محبت کا خمیر

وہ زمیں

اُس کا جلال

اس کا حشم

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں

کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں

کیا مجاہد نہ بنوں ؟

کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر

مرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر

ایسے ہنگامِ قیامت میں میرا نغمۂ شوق
کیا میرے ہم وطنوں کے دل میں
زندگی اور مسرّت بن کر
نہ سما جائے گا؟
قرۃُ العین! میری جان عزیز
او مرے فرزندو!
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالین

وہ مرا ملک جواں

وہ مرا بادۂ احمر کا جواں سال سبو

مری نوخیز مسرت کا جہاں

وہ مرا سرو رواں ملک جواں

ولد الجرم خطا کار درندوں نے جہاں

اپنے ناپاک ارادوں سے قدم رکھا ہے

ایک نوخیز کلی - ایک نو آغاز بشر

وہ مرا ملک جواں

سچ کہا ہے کہ "زمیں کے کیڑے

اپنی بے وقت اجل سے ڈر کر

تھرتھراتے ہوئے سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے

نکل آئے ہیں بلوں سے باہر"

اپنے فولاد سے روزن کے دہن بند کردو

اور فاشست شغالوں سے کہو
نغمۂ اول و آخر ہے یہی
قرۃ العین! مری جان عزیز
او مرے فرزندو!
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے۔
ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالین

یہی محشر ہے، دو عالم کا تصادم ہے یہی
ایک پرانا عالم
ایک نیا

ایک مرتی ہوئی بڑھیا کا لنگڑتا ہوا پاؤں

ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں

دوسرا۔ ایک ابھرتے ہوئے سینے کا شباب

تیز اور تند شراب

پیٹ سے رینگنے والے یہ نجس اور ناپاک

سوسمار

دورِ وحشت کے درندے

موذی

دہنِ آز و ہلاکت کا شکنجہ لے کر

مرے شاہیں کے خلاف

رات دن ہیں کہ چلے آتے ہیں

نہیں جائیں گے کبھی رائیگاں میرے نغمے

اور مرے ہم وطنوں کے نغمے

مرے شاہین تو منصور و مظفر ہی رہیں گے دائم

سوسماران خیز زندہ در گور

مرا شاہین، مرا استالین

مرے شاہین بچے، جن کا ابھی نام نہیں

سرخرو اور سرافراز فضاؤں میں بلند

ہاں مرے ہم وطنو

جاؤ اور اپنے سمندؔ دل کو مہمیز کرو

سُرخ فوجوں میں ملو

جوئے پر جوش بنو، برق کا سیلاب بنو اور رہو

اک دہکتے ہوئے پگھلے ہوئے لوہے کا سمندر بنکر

غضب آلود بھنور بن جاؤ

اور فاشست خنازیر کو

فی النّار کرو

مرے ملجاش کہاں ہے وہ مس سرخ ترا

اس سے کہنا سر دشمن پہ گرے شل بن کر

بحرِ اخضر کے او ماہی گیرو! غوطہ زنو

اپنا ذخیرہ لاؤ

اور قربانِ وطن کر ڈالو

معدنوں سے کہو اور کھیتوں کو آواز تو دو

لائیں وہ اپنے سن و سال کا حاصل لائیں

اور قربانِ وطن کر ڈالیں

یہ ہیں رہوار یہ پشمینہ ہے یہ خرمن ہیں

مرے محبوب وطن

سب کے سب تیرے ہیں سب تیرے ہیں
ایستالین نے میداں میں بلایا ہے ہمیں
کسب اور جہد کا پیغام سنایا ہے ہمیں
خطۂ قدس سے دشمن کو نکالو باہر
قازقستان!

وطن!
اپنی طاقت کو سمیٹے ہوئے اُٹھ
خیز با صد حشم و جاہ و جلال
بہ ہزاراں جبروت
ایک جان ایک جسد
پھونک دے دشمن ناپاک کی خاکستر کو

ملابار کے چار کمیونسٹ کسان جنہیں اپریل ۴۳ء میں پھانسی دیگئی

السّلام السّلام ——————

السّلام اے سُرخ جانبازانِ کیور السّلام

ہاں بڑھے گا زندگی کا کاروان تیز گام —————— السّلام
لیں گے ہم لیں گے شہیدوں کے لہو کا انتقام —————— السّلام

عہد کرتے ہیں مٹا دینگے یہ سولی کا نظام ——— السّلام

آل لینن آل استالین کا زندہ ہے نام ——— السّلام

ہاں بڑھے گا زندگی کا کاروانِ تیز گام

——— السّلام السّلام

السّلام اے سُرخ جانبازان کیوبا السّلام
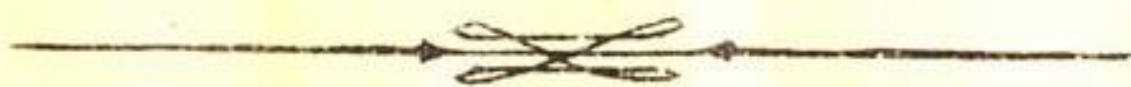
بنگال

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگرس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

وہ دیارِ ہندوستاں وہ سحر و نغمہ کا دیار
دیدنی ہے آج اس کی ناتوانی کی بہار

بھوک کا بیماریوں کا بم کے گولوں کا شکا
پیٹھ میں جاپان کا خنجر تو سر پہ سود خوا

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

تیر کے روزن سے اپنا سر نکالا موت نے
بے سہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے
خاندانوں کو بنا ڈالا نوالا موت نے
شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

اُمتِ مرحوم ہو یا ملتِ زنار دار
اُنکے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زن، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچوں کی پکار

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم

کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

آج اپنا گھر عدو کی رہگذر ہی کیوں نہ ہو
ہم بڑھے جائینگے رستہ پُرخطر ہی کیوں نہ ہو
ہم لڑے جائینگے دشمن بد گہر ہی کیوں نہ ہو
اپنی وردی خاک و خوں میں تر بتر ہی کیوں نہ ہو

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم